آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مجھے نہ کھولیں گے میں کھلنا پسند نہ کروں گا۔ چنانچہ جب آپ صبح کی نماز کے وقت مسجد میں تشریف لائے تو اپنے دستِ مبارک سے ان کو کھولا۔ آیت مذکورہ میں جو خیانت کرنے اور مال واولاد کی محبت سے مغلوب ہونے کی ممانعت کا ذکر آیا ہے اُس کا اصل سبب یہ واقعہ ہے۔ واللہ اعلم۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّيُكَفِّرْ

اے ایمان والو اگر تم ڈرتے رہو گے اللہ سے تو کردے گا تم میں فیصلہ اور دور کردے گا

عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝ وَاِذْ

تم سے تمہارے گناہ اور تم کو بخش دے گا، اور اللہ کا فضل بڑا ہے۔ اور جب

يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ۭ

فریب کرتے تھے کافر کہ تجھ کو قید کردیں یا مار ڈالیں یا نکال دیں،

وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۝ وَاِذَا تُتْلٰى

اور وہ بھی داؤ کرتے تھے اور اللہ بھی داؤ کرتا تھا، اور اللہ کا داؤ سب سے بہتر ہے۔ اور جب کوئی پڑھے

عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَاۗءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ ۙ اِنْ

ان پر ہماری آیتیں تو کہیں ہم سن چکے اگر ہم چاہیں تو ہم بھی کہہ لیں ایسا یہ تو

هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ وَاِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا

کچھ بھی نہیں مگر احوال ہیں اگلوں کے۔ اور جب وہ کہنے لگے کہ یا اللہ اگر یہی دین

هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَاۗءِ

حق ہے تیری طرف سے تو ہم پر برسا دے پتھر آسمان سے

اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ۚ

یا لا ہم پر کوئی عذاب دردناک۔ اور اللہ ہرگز نہ عذاب کرتا اُن پر جب تک تو رہتا ان میں،

وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ۝

اور اللہ ہرگز نہ عذاب کرے گا اُن پر جب تک وہ معافی مانگتے رہیں گے۔

خلاصۂ تفسیر

(اور) اے ایمان والو (اطاعت کی اور برکات سنو وہ یہ کہ) اگر تم اللہ سے ڈرو (کہ اطاعت

کرتے رہو گے) تو اللہ تعالیٰ تم کو ایک فیصلہ کی چیز دے گا (اس میں ہدایت اور نورِ قلب جس سے حق و باطل میں علمی فیصلہ ہوتا ہے اور غلبہ علی الاعداء اور نجات آخرت جس سے حق و باطل میں عملی فیصلہ ہوتا ہے سب آگیا) اور تم سے تمہارے گناہ دور کردے گا اور تم کو بخش دے گا اور اللہ بڑے فضل والا ہے (خدا جانے اپنے فضل سے اور کیا کیا دے دے جو قیاس وگمان میں بھی نہ آتا ہو) اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کے سامنے تذکیرِ نعمت کے لئے) اس واقعہ کا بھی ذکر کیجئے جب کہ کافر لوگ آپ کی نسبت (بُری بُری) تدبیریں سوچ رہے تھے کہ (آیا) آپ کو قید کرلیں یا آپ کو قتل کر ڈالیں یا آپ کو خارج وطن کردیں اور وہ تو اپنی تدبیریں کر رہے تھے اور اللہ اپنی تدبیر (ان تدبیروں کے دفع کرنے کے لئے) کر رہے تھے اور سب سے زیادہ مستحکم تدبیر والا اللہ ہے (جس کے سامنے ان کی ساری تدبیریں گاؤخورد ہوگئیں اور آپ بال بال محفوظ رہے اور صحیح سالم مدینہ آپہنچے۔ چونکہ آپ کا اس طرح بچ رہنا مؤمنین کے حق میں بے انتہا ابوابِ سعادات کی مفتاح ہے اس لئے اس واقعہ کے ذکر کا حکم فرمایا) اور (ان کفار کی یہ حالت ہے کہ) جب ان کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے سن (کر دیکھ) لیا (یہ تو کوئی معجزہ نہیں کیونکہ) اگر ہم ارادہ کریں تو اس کی برابر ہم بھی کہہ لائیں (پس) یہ (قرآن) تو (کلام الٰہی و معجزہ وغیرہ) کچھ بھی نہیں صرف بے سند باتیں ہیں جو پہلوں سے منقول چلی آرہی ہیں (کہ پہلے اہل ملل بھی یہی دعوٰی توحید و بعثت وغیرہ کے کرتے آئے ہیں انہی کے مضامین آپ نقل کر رہے ہیں) اور (اس سے بڑھ کر قابلِ ذکر وہ حالت ہے) جب کہ ان لوگوں نے (اپنے اس جہل مرکب میں غایت صلابت و جلادت ظاہر کرنے کو یہ بھی) کہا کہ اے اللہ اگر یہ قرآن آپ کی طرف سے واقعی ہے تو ہم پر (اس کے نہ ماننے کی وجہ سے) آسمان سے پتھر برسائیے یا ہم پر کوئی (اور) دردناک عذاب واقع کر دیجئے (جو کہ خارق عادت ہونے میں مثل بارش سنگ کے ہو اور جب ایسے عذاب واقع نہ ہوئے تو اپنی حقانیت پر ناز کرتے ہیں) اور (یہ نہیں سمجھتے کہ باوجود ان کے بطلان کے خاص موانع کی وجہ سے یہ عقوبات مذکورہ نازل نہیں ہوتیں ان موانع کا بیان یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ ایسا نہ کریں گے کہ ان میں آپ کے ہوتے ہوئے ان کو (ایسا) عذاب دیں اور (نیز) اللہ تعالیٰ ان کو (ایسا) عذاب نہ دیں گے جس حالت میں کہ وہ استغفار بھی کرتے رہتے ہیں (گو وہ آخرت میں بوجہ ایمان نہ ہونے کے نافع نہ ہو لیکن آخر عمل صالح ہے دنیا میں تو کفار کو نافع ہوجاتا ہے۔ مطلب یہ کہ ان عقوباتِ خارقہ سے دو امر مانع ہیں ایک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تشریف رکھنا مکہ میں یا دنیا میں۔ اور دوسرا ان لوگوں کا اپنے طواف وغیرہ میں یہ کہنا غفرانک جو کہ بعد ہجرت و بعد وفات بھی باقی تھا اور ایک مانع حدیثوں میں ہے کہ حضورؐ کی امت میں کسی کا ہونا گو امت دعوت ہی ہو یہ مانع باوجود کسی کے استغفار نہ کرنے کے

بھی باقی ہے پس یہ امور فی نفسہٖ مانع ہوئے گو احیاناً مانع کے ہوتے ہوئے بھی کوئی عذاب خارق کسی عارضی مصلحت سے واقع ہو جائے جیسا قذف و مسخ وغیرہ کا قرب قیامت میں ہونا حدیثوں میں وارد ہے)۔

معارف و مسائل

پچھلی آیت میں اس کا ذکر تھا کہ انسان کے لئے مال اور اولاد ایک فتنہ یعنی آزمائش کی چیز ہے۔ کیونکہ ان چیزوں کی محبت میں مغلوب ہو کر انسان عموماً خدا تعالیٰ اور آخرت سے غافل ہو جاتا ہے حالانکہ اس عظیم نعمت کا عقلی تقاضا یہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس احسان کی وجہ سے اُس کی طرف اور زیادہ جھکتا۔

مذکورہ آیات میں سے پہلی آیت اُسی مضمون کی تکمیل ہے اس میں فرمایا ہے کہ جو شخص عقل کو طبیعت پر غالب رکھ کر اس آزمائش میں ثابت قدم رہے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت و محبت کو سب چیزوں پر مقدم رکھے جس کو قرآن و شریعت کی اصطلاح میں تقویٰ کہا جاتا ہے تو اُس کو اس کے صلہ میں تین چیزیں عطا ہوتی ہیں فرقان، کفارۂ سیئات، مغفرت۔

فرقان اور فرق دونوں مصدر ایک ہی معنی کے ہیں۔ محاورات میں فرقان اُس چیز کے لئے بولا جاتا ہے جو دو چیزوں میں واضح طور پر فرق اور فصل کر دے۔ اسی لئے فیصلہ کو فرقان کہتے ہیں کیونکہ وہ حق اور ناحق میں فرق واضح کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مدد کو بھی فرقان کہا جاتا ہے کیونکہ اُس کے ذریعہ اہلِ حق کو فتح اور اُن کے مخالف کو شکست ہو کر حق و باطل کا فرق واضح ہو جاتا ہے قرآن کریم میں اسی معنی کے لئے غزوۂ بدر کو یوم الفرقان کے نام سے موسوم کیا ہے۔

اس آیت میں تقویٰ اختیار کرنے والوں کو فرقان عطا ہونے کا اکثر مفسرین صحابہ کے نزدیک یہی مفہوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت و امداد اور حفاظت اُن کے ساتھ ہوتی ہے کوئی دشمن اُن کو گزند نہیں پہنچا سکتا اور تمام مقاصد میں کامیابی اُن کی رفیق ہوتی ہے ؎

ہر کہ ترسید از حق و تقوٰے گزید ترسد از وے جن و انس و ہر کہ دید

تفسیر جہائی میں ہے کہ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ پچھلے واقعہ میں حضرت ابولبابہؓ سے جو اپنے اہل و عیال کی حفاظت کی خاطر لغزش ہو گئی تھی وہ اس لئے بھی خطا تھی کہ اہل و عیال کی حفاظت کا بھی صحیح راستہ یہی تھا کہ اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل اطاعت کو اپنا شعار بنایا جاتا تو سب مال و اولاد اللہ تعالیٰ کی پناہ اور حفاظت میں آجاتے۔ اور بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ فرقان سے مراد اس آیت میں وہ عقل و بصیرت ہے جس کے ذریعہ حق و باطل،

کھرے کھوٹے میں امتیاز کرنا سہل ہو جائے تو معنی یہ ہوئے کہ تقویٰ اختیار کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ ایسی بصیرت اور فراست عطا فرما دیتے ہیں کہ اُن کو اچھے بُرے میں فیصلہ کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

دوسری چیز جو تقویٰ کے صلہ میں عطا ہوتی ہے وہ کفارۂ سیئات ہے یعنی جو خطائیں اور لغزشیں اُس سے سرزد ہوتی ہیں دنیا میں ان کا کفارہ اور بدل کر دیا جاتا ہے یعنی اُس کو ایسے اعمال صالحہ کی توفیق ہو جاتی ہے جو اُس کی سب لغزشوں پر غالب آجاتے ہیں۔ تیسری چیز جو تقویٰ کے صلہ میں ملتی ہے وہ آخرت کی مغفرت اور سب گناہوں خطاؤں کی معافی ہے۔

آخر آیت میں ارشاد فرمایا وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ یعنی اللہ تعالیٰ بڑے فضل و احسان والے ہیں۔ اس میں اس طرف اشارہ کر دیا گیا کہ عمل کی جزاء تو عمل کے پیمانہ پر ہوتی ہے۔ یہاں بھی تقویٰ کی جو جزاء خیر تین چیزوں میں مذکور ہے وہ تو جزاء اور بدلہ کے طور پر ہے مگر اللہ تعالیٰ بڑے فضل و احسان والے ہیں اُن کی داد و دہش کسی پیمانہ کے ساتھ مقید نہیں اور اُن کے احسان و انعام کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا اس لئے تقویٰ اختیار کرنے والوں کے لئے اللہ تعالیٰ کے فضل و انعام سے ان تین چیزوں کے علاوہ بھی بہت بڑی امیدیں رکھنا چاہئے۔

دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ کے ایک خاص انعام و احسان کا ذکر ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام پر بلکہ پوری دنیا پر ہوا ہے۔ کہ قبل از ہجرت جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کفار کے نرغہ میں تھے اور وہ آپ کے قید یا قتل کرنے کے مشورے کر رہے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے ناپاک عزائم کو خاک میں ملا دیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بسلامت و عافیت مدینہ طیبہ پہنچا دیا۔

جس کا واقعہ تفسیر ابن کثیر اور مظہری میں بروایت محمد بن اسحاق و امام احمد و ابن جریرؒ وغیرہ یہ نقل کیا گیا ہے کہ جب مدینہ طیبہ سے آنے والے انصار کا مسلمان ہو جانا مکہ میں مشہور ہوا تو قریش مکہ کو یہ فکر دامنگیر ہو گئی کہ اب تک تو ان کا معاملہ صرف مکہ میں دائر تھا جہاں ہر طرح کی قوت ہمارے ہاتھ میں ہے اور اب جب کہ مدینہ میں اسلام پھیلنے لگا اور بہت سے صحابہ کرام ہجرت کر کے مدینہ طیبہ پہنچ گئے تو اب ان کا ایک مرکز مدینہ طیبہ قائم ہو گیا جہاں یہ ہر طرح کی قوت ہمارے خلاف جمع کر سکتے ہیں اور پھر ہم پر حملہ آور ہو سکتے ہیں۔ اور ان کو یہ بھی احساس ہو گیا کہ اب تک تو کچھ صحابہ کرام ہی ہجرت کر کے مدینہ طیبہ پہنچے ہیں اب یہ بھی قوی امکان ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی وہاں چلے جائیں اس لئے رؤسار مکہ نے مشورہ کے لئے دارالندوہ میں ایک خاص مجلس طلب کی۔ دارالندوہ مسجد حرام کے متصل قصی بن کلاب کا مکان تھا جس کو ان لوگوں نے قومی مسائل میں مشورہ اور مجلس کرنے کے لئے مخصوص کر رکھا تھا اور زمانہ اسلام میں اُس کو مسجد حرام میں داخل کر لیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ موجودہ باب الزیادات ہی وہ جگہ تھی جس کو دارالندوہ کہا جاتا تھا۔

حسب عادت اس مہم مشورہ کے لئے قریشی سرداروں کا اجتماع دارالندوہ میں ہوا جس میں ابوجہل۔ نضر بن حارث، عتبہ، شیبہ، امیہ بن خلف۔ ابوسفیان وغیرہ قریش کے تمام نمایاں اشخاص شامل ہوئے اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کی بڑھتی ہوئی قوت کے مقابلہ کی تدبیریں زیرِ غور آئیں۔

ابھی مشورہ کی مجلس شروع ہی ہوئی تھی کہ ابلیس لعین ایک سن رسیدہ عربی شیخ کی صورت میں دارالندوہ کے دروازہ پر آکھڑا ہوا۔ لوگوں نے پوچھا کہ تم کون ہو کیوں آئے ہو۔ بتلایا کہ میں نجد کا باشندہ ہوں مجھے معلوم ہوا کہ آپ لوگ ایک اہم مشورہ کر رہے ہیں تو قومی ہمدردی کے پیش نظر میں بھی حاضر ہو گیا کہ ممکن ہے میں کوئی مفید مشورہ دے سکوں۔

یہ سُن کر اس کو اندر بلا لیا گیا اور مشورہ شروع ہوا تو سہیلی کی روایت کے مطابق ابوالبختری ابن ہشام نے یہ مشورہ پیش کیا کہ ان کو یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آہنی زنجیروں میں قید کر کے مکان کا دروازہ بند کر دیا جائے اور چھوڑ دیا جائے یہاں تک کہ معاذ اللہ وہ آپ اپنی موت مر جائیں۔ یہ سن کر شیخ نجدی ابلیس لعین نے کہا کہ یہ رائے صحیح نہیں۔ کیونکہ اگر تم نے ایسا کیا تو معاملہ چھپے گا نہیں بلکہ اس کی شہرت دور دور پہنچ جائے گی اور ان کے صحابہ اور رفقاء کے فدائیانہ کارنامے تمہارے سامنے ہیں بہت ممکن ہے کہ یہ لوگ جمع ہو کر تم پر حملہ کر دیں اور اپنے قیدی کو تم سے چھڑا لیں۔ سب طرف سے آوازیں اُٹھیں کہ شیخ نجدی کی بات صحیح ہے اس کے بعد ابوالاسود نے یہ رائے پیش کی کہ ان کو مکہ سے نکال دیا جائے یہ باہر جا کر جو چاہیں کرتے رہیں ہمارا شہر ان کے فساد سے مامون ہو جائے گا۔ اور ہمیں کچھ جنگ و جدال بھی کرنا نہ پڑے گا۔

شیخ نجدی یہ سن کر پھر بولا کہ یہ رائے بھی صحیح نہیں، کیا تمہیں معلوم نہیں کہ وہ کیسے شیریں کلام آدمی ہیں لوگ اُن کا کلام سن کر مفتون اور مسحور ہو جاتے ہیں۔ اگر اُن کو اس طرح آزاد چھوڑ دیا تو بہت جلد اپنی طاقتور جماعت بنا لیں گے اور تم پر حملہ کر کے شکست دے دیں گے۔ اب ابوجہل بولا کہ جو کرنے کا کام ہے تم میں سے کسی نے نہیں سمجھا۔ میری سمجھ میں ایک بات آئی ہے وہ یہ کہ ہم عرب کے سب قبیلوں میں سے ہر قبیلہ کا ایک نوجوان لے لیں اور ہر ایک کو عمدہ کام کرنے والی تلوار دے دیں۔ یہ سب لوگ یکبارگی اُن پر حملہ کر کے قتل کر دیں۔ ہم ان کے فساد سے تو اس طرح نجات حاصل کر لیں۔ اب رہا اُن کے قبیلہ بنو عبد مناف کا مطالبہ جو ان کے قتل کا سبب ہم پر عائد ہوگا سو ایسی صورت میں جب کہ قتل کسی ایک نے نہیں بلکہ ہر قبیلہ کے ایک ایک شخص نے کیا ہے تو قصاص یعنی جان کے بدلے جان لینے کا مطالبہ تو باقی نہیں رہ سکتا۔ صرف خونبہا یا دیت کے مال کا مطالبہ رہ جائے گا وہ ہم سب قبیلوں سے جمع کر کے اُن کو دے دیں گے اور بے فکر ہو جائیں گے۔

شیخ نجدی ابلیس لعین نے یہ سُن کر کہا کہ بس رائے یہی ہے اور اس کے سوا کوئی چیز کارگر نہیں۔ پوری مجلس نے اسی کے حق میں رائے دے دی اور آج ہی رات میں اپنا یہ ناپاک عزم پورا کرنے کا تہیہ کر لیا گیا۔

مگر انبیاء علیہم السلام کی غیبی طاقت کو یہ جاہل کیا سمجھ سکتے تھے۔ اس طرف جبرئیل امین نے ان کے دارالشورہ کی ساری کیفیت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو باخبر کر کے یہ تدبیر بتلائی کہ آج رات میں آپ اپنے بستر پر آرام نہ کریں اور بتلایا کہ اب اللہ تعالیٰ نے آپ کو مکہ سے ہجرت کرنے کی اجازت دے دی ہے۔

ادھر مشورہ کے مطابق شام ہی سے قریشی نوجوانوں نے سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان کا محاصرہ کر لیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھا تو حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ کو حکم دیا کہ آج کی رات وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بستر پر آرام کریں اور یہ خوشخبری سنا دی کہ اگرچہ بظاہر اس میں آپ کی جان کا خطرہ ہے مگر دشمن آپ کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔

حضرت علی مرتضیٰؓ نے اس کام کے لئے اپنے آپ کو پیش کر دیا اور آپ کے بستر پر لیٹ گئے مگر اب مشکل یہ درپیش تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس محاصرہ سے کیسے نکلیں۔ اس مشکل کو اللہ تعالیٰ نے ایک معجزہ کے ذریعہ حل کیا وہ یہ کہ بامرِ الٰہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مٹھی میں مٹی بھر کر باہر تشریف لائے اور محاصرہ کرنے والے جو کچھ آپ کے بارہ میں گفتگو کر رہے تھے اُس کا جواب دیا مگر اللہ تعالیٰ نے ان کی نظروں اور فکروں کو آپ کی طرف سے پھیر دیا کہ کسی نے آپ کو نہ دیکھا حالانکہ آپ ان میں سے ہر ایک کے سر پر خاک ڈالتے ہوئے نکلے چلے گئے۔ آپ کے تشریف لے جانے کے بعد کسی آنے والے نے ان لوگوں سے پوچھا کہ یہاں کیوں کھڑے ہو تو اُنہوں نے بتلایا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے انتظار میں۔ اس نے کہا کہ تم کس خام خیالی میں ہو وہ تو یہاں سے نکل کر جا بھی چکے ہیں اور تم میں سے ہر ایک کے سر پر خاک ڈالتے ہوئے گئے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے اپنے سروں پر ہاتھ رکھا تو اس کی تصدیق ہوئی کہ ہر ایک کے سر پر مٹی پڑی ہوئی تھی۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ آپ کے بستر پر لیٹے ہوئے تھے مگر محاصرہ کرنے والوں نے ان کے کروٹیں بدلنے سے پہچان لیا کہ یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نہیں اس لئے قتل پر اقدام نہیں کیا۔ صبح تک محاصرہ کرنے کے بعد یہ لوگ خائب و خاسر ہو کر واپس ہو گئے۔ یہ رات اور اس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اپنی جان کو خطرہ میں ڈالنا حضرت علی مرتضیٰؓ کے خاص فضائل میں سے ہے۔

قریشی سرداروں کے مشورہ میں جو تین رائیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق پیش کی گئی تھیں اُن تینوں کو قرآن کریم کی اس آیت میں ذکر فرمایا ہے وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

لِيُثْبِتُوكَ أَوْ يَقْتُلُوكَ أَوْ يُخْرِجُوكَ ۔ یعنی وہ وقت یاد رکھنے کے قابل ہے جب کہ کفار آپ کے خلاف تدبیریں سوچ رہے تھے کہ آپ کو قید کریں یا قتل کر دیں یا شہر بدر کر دیں۔

مگر اللہ تعالیٰ نے ان کی سب تدبیریں خاک میں ملا دیں۔ اسی لئے آخرِ آیت میں فرمایا وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ ۔ یعنی اللہ تعالیٰ بہتر تدبیر کرنے والے ہیں۔ جو ساری تدبیروں پر غالب آجاتی ہے جیسا کہ اس واقعہ میں مشاہدہ ہوا۔

لفظ مکر کے معنی عربی لغت میں یہ ہیں کہ کسی حیلہ و تدبیر کے ذریعہ اپنے مقابل شخص کو اس کے ارادہ سے روک دیا جائے۔ پھر اگر یہ کام کسی نیک مقصد سے کیا جائے تو یہ مکر محمود اور اچھا ہے اور کسی بُرے مقصد سے کیا جائے تو مذموم اور بُرا ہے اس لئے یہ لفظ انسان کے لئے بھی بولا جا سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے لئے بھی۔ مگر اللہ تعالیٰ کے لئے صرف ایسے ماحول میں استعمال ہوتا ہے جہاں کلام کے سیاق اور تقابل کے ذریعہ مکر مذموم کا شبہ نہ ہو سکے (مظہری) جیسے یہاں ہے۔

اس جگہ یہ بات بھی قابل نظر ہے کہ آخر آیت میں جو الفاظ ارشاد فرمائے وہ بصیغہ مضارع ہیں جو حال و استقبال کے معنی پر دلالت کرتا ہے ارشاد فرمایا وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ یعنی وہ اہل ایمان کی ایذا رسانی کی تدبیریں کرتے رہیں گے اور اللہ تعالیٰ ان کی تدبیروں کے ناکام کرنے کی تدبیر کرتے رہیں گے اس میں اشارہ ہے کہ کفار کا یہ دائمی شعار رہے گا کہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی تدبیریں کریں اسی طرح اللہ تعالیٰ کی نصرت و امداد بھی ہمیشہ ہی سچے مسلمانوں سے ان کی تدبیروں کو دفع کرتی رہے گی۔

اکتیسویں اور بتیسویں آیتوں میں اسی دارالندوہ کے ایک شریک نضر بن حارث کی ایک بے ہودہ گفتگو اور تینتیسویں آیت میں اُس کا جواب مذکور ہے۔ نضر بن حارث چونکہ تجارت پیشہ آدمی تھا مختلف ملکوں کے سفروں میں یہود و نصاریٰ کی کتابیں اور اُن کی عبادتیں دیکھنے کا بار بار اتفاق ہوتا تھا اس لئے جب اس نے قرآن کریم میں پچھلی امتوں کے حالات سنے تو کہنے لگا کہ قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَاءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَا إِنْ هٰذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ۔ یعنی یہ باتیں تو ہماری سنی ہوئی ہیں اگر ہم چاہیں تو ہم بھی کہہ سکتے ہیں یہ تو پچھلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔ اور جب بعض صحابہ نے اُس کو جواب دیا کہ اگر تم ایسا کلام کہہ سکتے ہو تو پھر کہتے کیوں نہیں جب کہ قرآن نے حق و باطل کا فیصلہ اس پر رکھ دیا ہے اور پوری دنیا کو یہ چیلنج دیا ہے کہ اگر خلاف کرنے والے سچے ہیں تو قرآن کی ایک چھوٹی سی سورت ہی کی مثال پیش کریں۔ اور خلاف میں سر دھڑ کی بازی لگانے والے مال و اولاد قربان کرنے والے سب مل کر بھی ایک چھوٹی سی سورت قرآن کے مقابلہ میں پیش نہ کر سکے تو اب یہ کہنا کہ ہم چاہیں تو ہم بھی ایسا کلام کہہ سکتے ہیں ایک ایسی بات ہے جو کوئی غیرت مند آدمی نہیں کہہ سکتا۔ پھر جب نضر بن حارث سے

صحابہ کرام نے اس کلام الٰہی کا حق ہونا بیان کیا تو اپنے غلط مذہب پر پختگی دکھلانے کے لئے کہنے لگا۔ اَللّٰهُمَّ إِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَاءِ أَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۔ یعنی اے اللہ اگر یہی قرآن آپ کی طرف سے حق ہے تو ہم پر پتھر برسا دیجئے یا کوئی دوسرا سخت عذاب نازل کر دیجئے۔

قرآن کریم نے خود اس کا جواب دیا۔ پہلے ارشاد فرمایا وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ یعنی اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کریں گے کہ آپ کے مکہ میں ہوتے ہوئے اُن پر عذاب نازل کریں۔ کیونکہ اوّل تو سب ہی انبیاء علیہم السلام کے ساتھ حق تعالیٰ کا دستور یہ ہے کہ جس بستی میں وہ موجود ہوں اُس پر اُس وقت تک عذاب نازل نہیں فرماتے جب تک اپنے پیغمبروں کو وہاں سے نکال نہ لیں۔ جیسے حضرت ہود علیہ السلام اور صالح علیہ السلام اور لوط علیہ السلام کے معاملہ میں مشاہدہ ہوا کہ جب تک یہ حضرات بستی میں رہے عذاب نہیں آیا جب وہاں سے نکال لئے گئے اس وقت عذاب نازل ہوا۔ خصوصاً سید الانبیاء جو رحمۃ للعالمین کا لقب دے کر بھیجے گئے ہیں آپ کے کسی بستی میں موجود ہوتے ہوئے اُن پر عذاب آنا آپ کی شان کے خلاف تھا۔

خلاصہ جواب کا یہ ہوا کہ تم تو قرآن اور اسلام کی مخالفت کی وجہ سے اسی کے مستحق ہو کہ تم پر پتھر برسائے جائیں مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مکہ میں موجود ہونا اس سے مانع ہے۔ امام ابن جریرؒ نے فرمایا کہ آیت کا یہ حصہ اُس وقت نازل ہوا جب کہ آپ مکہ مکرمہ میں موجود تھے پھر ہجرتِ مدینہ کے بعد آیت کا دوسرا حصہ یہ نازل ہوا وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ ۔ یعنی اللہ تعالیٰ اُن پر عذاب نازل کرنے والے نہیں جب کہ وہ استغفار کرتے ہیں۔ مراد اس سے یہ ہے کہ آپ کے مدینہ شریف چلے جانے کے بعد اگرچہ عذابِ عام کا یہ مانع رفع ہو گیا کہ آپ وہاں موجود تھے مگر اس وقت بھی ایک مانع عذاب کا یہ موجود رہا کہ بہت سے ضعفاء مسلمین جو ہجرت نہ کر سکتے تھے مکہ میں رہ گئے تھے اور وہ اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتے رہتے تھے۔ اُن کی خاطر سے اہلِ مکہ پر عذاب نازل نہیں کیا گیا۔

پھر جب یہ سب حضرات بھی ہجرت کر کے مدینہ منورہ پہنچ گئے تو بعد کی آیت کا یہ جملہ نازل ہوا وَمَا لَهُمْ أَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمْ يَصُدُّونَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۔ یعنی یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو عذاب نہ دیں حالانکہ وہ لوگوں کو مسجد حرام میں عبادت کرنے سے روکتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ اب مانع عذاب دونوں رفع ہو چکے، نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں رہے اور نہ استغفار کرنے والے مسلمان مکہ میں باقی رہے تو اب عذاب آنے سے کوئی رکاوٹ باقی نہیں۔ خصوصاً ان کے استحقاقِ عذاب میں خود مخالف اسلام ہونے کے علاوہ اس جرم کا بھی اضافہ ہو گیا کہ

یہ لوگ خود تو عبادت کے قابل نہ تھے اور جو مسلمان عبادت عمرہ وطواف کے لئے مسجد حرام میں جانا چاہیں اُن کو روکنے لگے تو اب ان کا استحقاقِ عذاب بالکل مکمل ہوگیا چنانچہ فتح مکہ کے ذریعہ ان پر عذاب نازل کیا گیا۔

مسجد حرام میں داخل ہونے سے روکنے کا واقعہ غزوۂ حدیبیہ میں پیش آیا تھا جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کے ساتھ عمرہ کے قصد سے تشریف لے گئے اور مشرکین مکہ نے آپ کو مکہ میں داخل ہونے سے روک دیا اور آپ کو اور سب صحابہ کرام کو اپنے احرام کھولنے اور واپس جانے پر مجبور کیا یہ واقعہ سنہ ۶ ہجری کا ہے اس کے دو سال بعد سنہ ۸ میں مکہ مکرمہ فتح ہوگیا، اس طرح ان پر مسلمانوں کے ہاتھوں اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوا۔

ابن جریرؒ کی اس تفسیر کا مدار اس پر ہے کہ مانع عذاب آپ کا مکہ میں ہونا قرار دیا جائے اور بعض حضرات نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دنیا میں وجود مانع عذاب ہے جب تک آپ دنیا میں تشریف فرما ہیں آپ کی قوم پر عذاب نہیں آسکتا۔ اور وجہ اس کی ظاہر ہے کہ آپ کا حال دوسرے انبیاء کی طرح نہیں کہ وہ خاص خاص مقامات یا قبائل کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ جب وہاں سے نکل کر کسی دوسرے خطہ میں پہنچ گئے تو ان کی قوم پر عذاب آجاتا تھا۔ بخلاف سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ آپ کی نبوت و رسالت سارے عالم کے لئے اور قیامت تک کے لئے عام اور شامل ہے پوری دنیا آپ کا مقام بعثت اور دائرہ رسالت ہے اس لئے جب تک آپ دنیا کے کسی حصہ میں موجود ہیں آپ کی قوم پر عذاب نہیں آسکتا۔

اس تفسیر پر مطلب یہ ہوگا کہ اہل مکہ کے افعال کا تقاضا تو یہی تھا کہ ان پر پتھر برسائے جائیں مگر دو چیزیں اس عذاب سے مانع ہوئیں ایک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دنیا میں تشریف فرما ہونا، دوسرے اہل مکہ کا استغفار کرنا کیونکہ یہ لوگ مشرک و کافر ہونے کے باوجود اپنے طواف وغیرہ میں غفرانک غفرانک کہا کرتے اور اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کیا کرتے تھے۔ ان کا یہ استغفار کفر و شرک کے ساتھ گو آخرت میں نافع نہ ہو مگر دنیا میں اُس کا بھی یہ نفع اُن کو مل گیا کہ دنیا میں عذاب سے بچ گئے۔ اللہ تعالیٰ کسی کے عمل کو ضائع نہیں کرتے، کفار و مشرکین اگر کوئی نیک عمل کرتے ہیں تو اس کا بدلہ اُن کو اسی دنیا میں دے دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد جو یہ ارشاد فرمایا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کو عذاب نہ دے حالانکہ یہ لوگ مسلمانوں کو مسجد حرام میں عبادت کرنے سے روکتے ہیں، اس کا مطلب اس صورت میں یہ ہوگا کہ دنیا میں عذاب نہ ہونے سے یہ لوگ مغرور اور مطمئن نہ ہو جائیں کہ ہم مجرم ہی نہیں یا ہم پر عذاب نہیں ہوگا۔ اگر دنیا میں نہ ہوا تو آخرت کے عذاب سے ان کی کسی طرح نجات نہیں۔ اس تفسیر پر مَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ میں عذاب سے عذاب آخرت مراد ہوگا۔

آیاتِ مذکورہ سے چند فوائد حاصل ہوئے۔ اوّل یہ کہ جس بستی میں لوگ استغفار کرتے ہوں اللہ تعالیٰ کا دستور یہ ہے کہ اُس پر عذاب نازل نہیں کرتے۔

دوسرے یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہوتے ہوئے آپ کی اُمت پر خواہ مسلم ہوں یا کافر عذاب نہیں آئے گا اور مراد اس سے یہ ہے کہ عذاب عام جس سے پوری قوم تباہ ہو جائے ایسا عذاب نہیں آئے گا جیسے قوم نوح، قوم لوط، قوم شعیب وغیرہ کے ساتھ پیش آیا کہ اُن کا نام و نشان مٹ گیا۔ افراد و احاد پر کوئی عذاب آجائے وہ اس کے منافی نہیں جیسا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میری اُمت میں خسف اور مسخ کا عذاب آئے گا۔ خسف کے معنی زمین میں اُتر جانا اور مسخ کے معنی صورت مسخ ہو کر بندر یا سُوَر وغیرہ جانوروں کی شکل میں تبدیل ہو جانا۔ اس کی مراد یہی ہے کہ بعض بعض افرادِ اُمت پر ایسے عذاب بھی آئیں گے۔

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دنیا میں ہونا قیامت تک باقی رہے گا کیونکہ آپ کی رسالت قیامت تک کے لئے ہے۔ نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت بھی زندہ ہیں گو اُس زندگی کی صورت سابق زندگی سے مختلف ہے اور یہ بحث لغو اور فضول ہے کہ ان دونوں زندگیوں میں فرق کیا ہے کیونکہ نہ اس پر اُمت کا کوئی دینی یا دنیوی کام موقوف ہے نہ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے ایسی فضول اور بے ضرورت بحثوں کو پسند فرمایا بلکہ منع فرمایا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے روضہ میں زندہ ہونا اور آپ کی رسالت کا قیامت تک قائم رہنا اس کی دلیل ہے کہ آپ قیامت تک دنیا میں ہیں اس لئے یہ اُمت قیامت تک عذاب عام سے مأمون رہے گی۔

وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمْ يَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ
اور ان میں کیا بات ہے کہ عذاب نہ کرے اُن پر اللہ اور وہ تو روکتے ہیں مسجد حرام سے
وَمَا كَانُوْٓا اَوْلِيَآءَهٗ ۭ اِنْ اَوْلِيَاۗؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ
اور وہ اس کے اختیار والے نہیں، اس کے اختیار والے تو وہی ہیں جو پرہیزگار ہیں لیکن ان میں اکثروں کو
لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَاۗءً وَّ
اس کی خبر نہیں۔ اور اُن کی نماز نہیں تھی کعبہ کے پاس مگر سیٹیاں بجانی اور
تَصْدِيَةً ۭ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ
تالیاں، سو چکھو عذاب بدلہ اپنے کفر کا۔ بیشک جو لوگ

كَفَرُوْا يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ فَسَيُنْفِقُوْنَهَا

کافر ہیں وہ خرچ کرتے ہیں اپنے مال تاکہ روکیں اللہ کی راہ سے ، سو ابھی اور خرچ کریں گے

ثُمَّ تَكُوْنُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُوْنَ ۭ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ

پھر آخر ہوگا وہ اُن پر افسوس اور آخر مغلوب ہوں گے ، اور جو کافر ہیں وہ دوزخ کی طرف

يُحْشَرُوْنَ ۝ لِيَمِيْزَ اللّٰهُ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَيَجْعَلَ الْخَبِيْثَ

ہانکے جائیں گے ۔ تاکہ جدا کر دے اللہ ناپاک کو پاک سے اور رکھے ناپاک کو

بَعْضَهٗ عَلٰي بَعْضٍ فَيَرْكُمَهٗ جَمِيْعًا فَيَجْعَلَهٗ فِيْ جَهَنَّمَ ۭ اُولٰۗىِٕكَ

ایک کو ایک پر پھر اُس کو ڈھیر کر دے اکٹھا پھر ڈال دے اُس کو دوزخ میں ، وہی لوگ

هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝ قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا ع ۴ ۱۸

ہیں نقصان میں ۔ تو کہہ دے کافروں کو کہ اگر وہ باز آجائیں تو معاف ہو اُن کو جو کچھ

قَدْ سَلَفَ ۚ وَاِنْ يَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ ۝

ہو چکا ، اور اگر پھر بھی وہی کریں گے تو پڑ چکی ہے راہ اگلوں کی ۔

خلاصۂ تفسیر

اور (ان موانع کے سبب عذاب خارق نازل نہ ہونے سے بالکل ہی عذاب سے مطمئن نہ ہو جائیں کیونکہ جس طرح امور مذکورہ مانع عذاب ہیں اسی طرح ان کی حرکتیں مقتضی عذاب بھی ہیں پس مانع کا اثر عذاب خارق میں ظاہر ہوا اور مقتضی کا اثر نفس عذاب میں ظاہر ہوگا کہ عذاب غیر خارق ان پر نازل ہوگا چنانچہ اس مقتضی کا بیان فرماتے ہیں کہ) ان کا کیا استحقاق ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ (بالکل ہی معمولی) سزا (بھی) نہ دے حالانکہ (ان کی یہ حرکتیں مقتضی سزا کی ہیں مثلاً) وہ لوگ (پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو) مسجد حرام (میں جانے اور اس میں نماز پڑھنے اور اس میں طواف کرنے) سے روکتے ہیں (جیسا حدیبیہ میں حقیقۃً روکا جس کا قصہ سورۂ بعثرہ میں گزر چکا اور زمانۂ قیام مکہ میں حکماً روکا کہ اس قدر تنگ کیا کہ ہجرت کی ضرورت ہوئی) حالانکہ وہ لوگ اس مسجد کے متولی (بننے کے بھی لائق) نہیں (اور عابدین کو روکنا تو درکنار رہا جس کا اختیار خود متولی کو بھی نہیں ہوتا) اس کے متولی (بننے کے لائق) تو سوا متقیوں کے (کہ وہ اہل ایمان ہیں) اور کوئی بھی اشخاص نہیں لیکن ان میں اکثر لوگ (اپنی نالائقی کا) علم نہیں رکھتے (خواہ علم ہی نہ ہو یا یہ کہ جب

اس علم پر عمل نہ کیا تو وہ مثل عدم علم کے ہے غرض جو سچے نمازی تھے ان کو تو مسجد سے اس طرح روکا) اور (خود مسجد کا کیسا حق ادا کیا اور اس میں کیسی اچھی نماز پڑھی جس کا بیان یہ ہے کہ) ان کی نماز خانۂ کعبہ (مذکور بعنوان مسجد حرام) کے پاس صرف یہ تھی سیٹیاں بجانا اور تالیاں بجانا (یعنی بجائے نماز کے ان کی یہ نامعقول حرکتیں ہوتی تھیں) سو (ان حرکات کا ضرور مقتضا ہے کہ ان پر کوئی نہ کوئی عذاب گو وہ معمولی اور عادی ہو نازل کر کے ان کو خطاب کیا جائے کہ لو) اس عذاب کا مزہ چکھو اپنے کفر کے سبب (جس کا ایک اثر وہ قول ہے لَوْ نَشَآءُ الخ اور ایک اثر وہ قول ہے۔ اِنْ كَانَ هٰذَا الخ اور ایک اثر وہ فعل ہے۔ يَصُدُّوْنَ الخ اور ایک اثر وہ فعل ہے۔ مُكَآءً وَّتَصْدِيَةً الخ۔ چنانچہ غزوات متعددہ میں یہ سزا واقع ہوئی جیسا کہ اس سورت کے رکوع دوم میں بھی ہے ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ الخ بَعْدَ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَاۗقُّوا الخ کے یہاں تک تو ان لوگوں کے اقوال و اعمال بدنیہ کا ذکر تھا آگے ان کے اعمال مالیہ کا بیان ہے کہ) بلاشک یہ کافر لوگ اپنے مالوں کو اس لئے خرچ کر رہے ہیں کہ اللہ کی راہ سے (یعنی دین سے لوگوں کو) روکیں (چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ اور مخالفت کے سامان جمع کرنے میں ظاہر ہے کہ جو خرچ ہوتا تھا اس میں یہی غرض تھی) سو یہ لوگ تو اپنے مالوں کو (اسی غرض کے لئے) خرچ کرتے ہی رہیں گے (مگر) پھر (آخر میں جب آثار ناکامی کے محسوس ہوں گے) وہ مال ان کے حق میں باعث حسرت ہو جائیں گے (کہ خواہ مخواہ خرچ کیا اور) پھر (آخر) مغلوب (ہی) ہو جائیں گے (جس سے حسرت ضیاع اموال کے ساتھ یہ دوسری حسرت مغلوبیت کی جمع ہو جائے گی) اور (یہ سزا و حسرت و مغلوبیت تو ان کی دنیا میں ہے باقی آخرت کی سزا وہ الگ ہے جس کا بیان یہ ہے کہ) کافر لوگوں کو دوزخ کی طرف (لے جانے کے لئے قیامت میں) جمع کیا جائے گا تاکہ اللہ تعالیٰ ناپاک (لوگوں) کو پاک (لوگوں) سے الگ کر دے (کیونکہ جب دوزخیوں کو دوزخ کی طرف لائیں گے ظاہر ہے کہ اہل جنت ان سے علیحدہ رہ جائیں گے) اور (ان سے الگ کر کے) ناپاکوں کو ایک دوسرے سے ملا دے یعنی ان سب کو متصل کر دے پھر (متصل کر کے) ان سب کو جہنم میں ڈال دے ایسے ہی لوگ پورے خسارہ میں ہیں (جس کا کہیں منتہیٰ نہیں، اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ ان کافروں سے کہہ دیجئے کہ اگر یہ لوگ (اپنے کفر سے) باز آجائیں گے (اور اسلام قبول کر لیں گے) تو ان کے سارے گناہ جو (اسلام سے) پہلے ہو چکے ہیں سب معاف کر دیئے جائیں گے (یہ حکم تو حالت اسلام کا ہوا) اور اگر اپنی وہی (کفر کی) عادت رکھیں گے تو (ان کو سنا دیجئے کہ) کفار سابقین کے حق میں (ہمارا) قانون نافذ ہو چکا ہے (کہ دنیا میں ہلاک اور آخرت میں عذاب وہی تمہارے لئے ہوگا چنانچہ قتل سے ہلاک بھی ہوئے اور غیر کفار عرب کا ہلاک ذمی ہونا بھی ہے تم جانو)۔

معارف و مسائل

پچھلی آیتوں میں یہ بتلایا گیا تھا کہ مشرکین مکہ اپنے کفر و انکار کی وجہ سے اگرچہ اس کے مستحق ہیں کہ ان پر آسمانی عذاب آجائے لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مکہ میں موجود ہونا عذاب عام آنے سے مانع ہے اور ہجرت کے بعد اُن ضعفاء مسلمین کی وجہ سے ایسا عذاب نہیں آتا جو مکہ میں رہ کر اللہ سے استغفار کرتے رہتے ہیں۔

مذکورہ آیتوں میں یہ بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا ضعفاء مسلمین کی رعایت سے اگر دنیا میں اُن کا عذاب ٹل ہی گیا تو ان لوگوں کو یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ یہ عذاب کے مستحق نہیں بلکہ ان کا استحقاق عذاب کھلا ہوا ہے اور علاوہ کفر و انکار کے اور بھی ان کے ایسے جرائم ہیں جن کی وجہ سے ان پر عذاب آجانا چاہئے۔ ان دونوں آیتوں میں اُن کے تین جرم شمار کئے گئے ہیں۔

اول یہ کہ یہ لوگ خود تو مسجد حرام میں عبادت گزاری کے قابل ہی نہیں اور جو مسلمان وہاں عبادت نماز طواف وغیرہ ادا کرنا چاہتے ہیں اُن کو آنے سے روک دیتے ہیں۔ اس میں واقعہ حدیبیہ کی طرف اشارہ ہے جب کہ ۶ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کے ساتھ عمرہ ادا کرنے کے لئے مکہ مکرمہ پہنچے تھے اور مشرکین مکہ نے آپ کو روک کر واپس جانے پر مجبور کیا تھا۔

دوسرا جرم یہ فرمایا کہ یہ بے وقوف یوں سمجھتے اور کہتے ہیں کہ ہم مسجد حرام کے متولی ہیں جس کو چاہیں اس میں آنے کی اجازت دیں جس کو چاہیں نہ دیں۔

ان کا یہ خیال دو غلط فہمیوں کا نتیجہ تھا اول یہ کہ اپنے آپ کو مسجد حرام کا متولی سمجھا حالانکہ کوئی کافر کسی مسجد کا متولی نہیں ہو سکتا دوسرے یہ کہ متولی کو یہ حق ہے کہ جس کو چاہے مسجد میں آنے سے روک دے جب کہ مسجد خانۂ خدا ہے اُس میں آنے سے روکنے کا کسی کو حق نہیں بجز ایسی خاص صورتوں کے جن میں مسجد کی بے حرمتی یا دوسرے نمازیوں کی تکلیف کا اندیشہ ہو۔ جیسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنی مسجدوں کو بچاؤ چھوٹے بچوں سے، اور پاگل آدمیوں سے اور باہمی جھگڑوں سے چھوٹے بچوں سے مراد وہ بچے ہیں جن سے ناپاکی کا خطرہ ہے اور پاگل سے ناپاکی کا بھی خطرہ ہے اور نمازیوں کی ایذاء کا بھی۔ اور باہمی جھگڑوں سے مسجد کی بے حرمتی بھی ہے اور نمازیوں کی ایذاء بھی۔

اس حدیث کی رو سے متولی مسجد کے لئے یہ تو حق ہے کہ ایسے چھوٹے بچوں، پاگلوں کو مسجد میں نہ آنے دے اور باہمی جھگڑے مسجد میں نہ ہونے دے لیکن بغیر ایسی صورتوں کے کسی مسلمان کو مسجد سے روکنے کا کسی متولی مسجد کو حق نہیں۔

قرآن کریم کی آیت متذکرہ میں صرف پہلی بات بیان کرنے پر اکتفاء کیا کہ ان لوگوں کو مسجد حرام کا متولی کیسے مانا جائے۔ جب کہ اصول یہ ہے کہ اُس کے متولی صرف متقی مسلمان ہی ہو سکتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسجد کا متولی مسلمان دیندار پرہیزگار ہونا چاہئے اور بعض حضرات مفسرین نے اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع قرار دے کر یہ معنی لکھے ہیں کہ اللہ کے ولی صرف متقی پرہیزگار لوگ ہو سکتے ہیں۔

اس تفسیر کے مطابق آیت سے یہ نتیجہ نکلا کہ جو لوگ شریعت و سنت کے خلاف عمل کرنے کے باوجود ولی اللہ ہونے کا دعویٰ کریں وہ جھوٹے ہیں اور جو ایسے لوگوں کو ولی اللہ سمجھیں وہ دھوکے میں ہیں۔

تیسرا جرم ان لوگوں کا یہ بتلایا کہ کفر و شرک کی گندگی تو تھی ہی ان کے افعال و اعمال تو عام انسانی سطح سے بھی گرے ہوئے ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ اپنے جس فعل کا نام نماز رکھتے ہیں وہ بجز اس کے نہیں کہ اُس میں کچھ مُنہ سے سیٹیاں بجائیں کچھ ہاتھوں سے تالیاں اور یہ ظاہر ہے کہ جس کو ذرا بھی عقل ہو وہ ان افعال کو عبادت و نماز کیا کوئی صحیح انسانی فعل بھی نہیں کہہ سکتا۔ اس لئے آخر آیت میں ارشاد فرمایا فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ یعنی تمہارے کفر اور جرائم کا انجام یہی ہے کہ اب اللہ کا عذاب چکھو۔ عذاب سے اس جگہ عذاب آخرت بھی مراد ہو سکتا ہے اور عذاب دنیا بھی جو غزوۂ بدر میں مسلمانوں کے ہاتھوں ان پر نازل ہوا۔

اس کے بعد چھتیسویں آیت میں کفار مکہ کے ایک اور واقعہ کا بیان ہے جس میں انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف قوت جمع کرنے کے لئے مالِ عظیم جمع کیا اور پھر اُس کو دینِ حق اور مسلمانوں کے مٹانے کے لئے خرچ کیا۔ مگر انجام کار یہ ہوا کہ وہ مال بھی ہاتھ سے گیا اور مقصد حاصل ہونے کے بجائے خود ذلیل و خوار ہوئے۔

واقعہ اس کا بروایت محمد بن اسحاق حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ منقول ہے کہ غزوۂ بدر کے شکست زدہ زخم خوردہ بچے کھچے کفار مکہ جب وہاں سے واپس مکہ پہنچے تو جن لوگوں کے باپ بیٹے اس جہاد میں مارے گئے تھے وہ تجارتی قافلہ کے امیر ابوسفیان کے پاس پہنچے اور کہا کہ آپ جانتے ہیں کہ یہ جنگ تمہارے تجارتی قافلہ کی حفاظت کے لئے لڑی گئی جس کے نتیجہ میں یہ تمام جانی اور مالی نقصانات اٹھانے پڑے۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ اس مشترک تجارتی کمپنی سے ہماری کچھ مدد کی جائے تاکہ ہم آئندہ مسلمانوں سے اپنا انتقام لے سکیں۔ ان لوگوں نے اس کو منظور کر کے ایک بڑی رقم دے دی جس کو انھوں نے غزوۂ بدر کا انتقام لینے کے لئے غزوۂ اُحد میں خرچ کیا اور اس میں بھی انجام کار مغلوب ہوئے اور شکست کے غم کے ساتھ مال ضائع کرنے کی حسرت مزید ہو گئی۔

قرآن کریم نے اس آیت میں یہ واقعہ پیش آنے سے پہلے ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے

انجام کی خبر دے دی۔ ارشاد فرمایا، وہ لوگ جو کافر ہیں اپنے مالوں کو اس کام کے لئے خرچ کرنا چاہتے ہیں کہ لوگوں کو اللہ کے دین سے روک دیں۔ سو اس کا انجام یہ ہوگا کہ یہ اپنا مال بھی خرچ کر ڈالیں گے اور پھر ان کو مال خرچ کرنے پر حسرت ہوگی، اور انجام کار مغلوب ہو جائیں گے۔ چنانچہ غزوۂ اُحد میں ٹھیک یہی صورت ہوئی کہ جمع شدہ مال بھی خرچ کر ڈالا۔ اور پھر مغلوب ہوئے تو شکست کے غم کے ساتھ مال ضائع ہونے پر الگ حسرت وندامت ہوئی۔

اور بغوی وغیرہ بعض مفسرین نے اس آیت کے مضمون کو خود غزوۂ بدر کے اخراجات پر محمول فرمایا ہے کہ غزوۂ بدر میں ایک ہزار جوانوں کا جو لشکر مسلمانوں کے مقابلہ پر گیا تھا ان کے کھانے پینے وغیرہ کے کل اخراجات مکہ کے بارہ سرداروں نے اپنے ذمہ لئے تھے جن میں ابوجہل، عتبہ، شیبہ وغیرہ شامل تھے۔ ظاہر ہے کہ ایک ہزار آدمیوں کے آنے جانے کھانے پینے وغیرہ کے اخراجات پر بڑی رقم خرچ ہوئی۔ تو ان لوگوں کو اپنی شکست کے ساتھ اپنے اموال ضائع ہونے پر بھی شدید حسرت و ندامت پیش آئی۔ (مظہری)

آخر آیت میں آخرت کے اعتبار سے ان لوگوں کے انجام بد کا بیان ہے وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ يُحْشَرُوْنَ۔ یعنی جو لوگ کافر ہیں اُن کا حشر جہنم کی طرف ہوگا۔

مذکورہ آیتوں میں دینِ حق سے روکنے کے لئے مال خرچ کرنے کا جو انجام بد ذکر کیا گیا ہے اُس میں آج کے وہ کفار بھی داخل ہیں جو لوگوں کو اسلام سے روکنے اور اپنے باطل کی طرف دعوت دینے پر لاکھوں روپیہ شفاخانوں، تعلیم گاہوں اور صدقہ خیرات کے عنوان سے خرچ کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ گمراہ لوگ بھی اس میں داخل ہیں جو اسلام کے اجماعی عقائد میں شبہات و اوہام پیدا کر کے اُن کے خلاف لوگوں کو دعوت دینے کے لئے اپنے اموال خرچ کرتے ہیں لیکن حق تعالیٰ اپنے دین کی حفاظت فرماتے ہیں اور بہت سے مواقع میں مشاہدہ بھی ہو جاتا ہے کہ یہ لوگ بڑے بڑے اموال خرچ کرنے کے باوجود اپنے مقصد میں ناکام رہتے ہیں۔

سینتیسویں آیت میں واقعاتِ مذکورہ کے کچھ نتائج کا بیان ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اپنے جو اموال کفار نے اسلام کے خلاف استعمال کئے اور پھر اُن کو حسرت وندامت ہوئی اور ذلیل و خوار ہوئے اس کا فائدہ یہ ہے کہ

لِيَمِيْزَ اللّٰهُ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ۔ یعنی تاکہ اللہ تعالیٰ گندی چیز اور پاک صاف چیز میں فرق ظاہر کر دیں۔ لفظ خبیث اور طیب دو متقابل لفظ ہیں۔ لفظ خبیث ناپاک، گندے اور حرام کے لئے بولا جاتا ہے اور طیب اس کے بالمقابل پاک صاف ستھرے اور حلال کے لئے بولا جاتا ہے۔ اس جگہ ان دونوں لفظوں سے کفار کے اموال خبیثہ اور مسلمانوں کے اموال طیبہ بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ اس صورت میں

مطلب یہ ہے کہ کفار نے جو مال عظیم خرچ کئے وہ مال خبیث اور ناپاک تھے اُس کا بُرا نتیجہ یہ حاصل ہوا کہ مال بھی گیا اور جانیں بھی گئیں اس کے بالمقابل مسلمانوں نے بہت تھوڑا مال خرچ کیا مگر وہ مال پاک اور حلال تھا۔ اُن کے خرچ کرنے والے کامیاب ہوئے اور مزید مالِ غنیمت بھی ہاتھ آیا اس کے بعد ارشاد فرمایا۔

وَيَجْعَلَ الْخَبِيْثَ بَعْضَهٗ عَلٰى بَعْضٍ فَيَرْكُمَهٗ جَمِيْعًا فَيَجْعَلَهٗ فِيْ جَهَنَّمَ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝	یعنی اللہ تعالیٰ جمع کر دیتا ہے ایک خبیث کو دوسرے خبیث کے ساتھ پھر ان سب کو جمع کر دے گا جہنم میں یہی لوگ خسارہ میں پڑنے والے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ جس طرح دنیا میں مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے کہربا گھاس کو کھینچتا ہے اور نئی سائنس کے تجربات میں ساری دنیا کا نظام ہی باہمی کشش پر قائم ہے اسی طرح اعمال و اخلاق میں بھی کشش ہے۔ ایک بُرا عمل دوسرے بُرے عمل کو اور ایک اچھا عمل دوسرے اچھے عمل کو کھینچتا ہے مالِ خبیث دوسرے مالِ خبیث کو کھینچتا ہے اور یہ پھر اموالِ خبیثہ آثارِ خبیثہ پیدا کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آخرت میں جتنے اموالِ خبیثہ ہیں سب کو جہنم میں جمع فرما دیں گے۔ اور یہ مال والے بڑے خسارہ میں پڑ جائیں گے۔

اور بہت سے حضرات مفسرین نے اس جگہ خبیث اور طیب کی مراد عام قرار دی ہے یعنی پاک اور ناپاک۔ پاک سے مؤمن اور ناپاک سے کافر مراد ہیں۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ حالاتِ مذکورہ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ یہ چاہتے ہیں کہ پاک و ناپاک یعنی مؤمن و کافر میں امتیاز ہو جائے مؤمنین جنت میں اور کفار سب ایک جگہ جہنم میں جمع کر دیئے جائیں۔

اڑتیسویں آیت میں کفار کے لئے پھر ایک مربیانہ خطاب ہے جس میں ترغیب بھی ہے اور ترہیب بھی۔ ترغیب اس کی ہے کہ اگر وہ ان تمام افعال شنیعہ کے بعد اب بھی توبہ کر لیں اور ایمان لے آئیں تو پچھلے سب گناہ معاف کر دیئے جائیں گے اور ترہیب یہ کہ اگر وہ اب بھی باز نہ آئے تو سمجھ لیں کہ اُن کے لئے اللہ تعالیٰ کو کوئی نیا قانون بنانا یا سوچنا نہیں پڑتا۔ پہلے زمانہ کے کافروں کے لئے جو قانون جاری ہو چکا ہے وہ ہی اُن پر بھی جاری ہوگا کہ دنیا میں ہلاک و برباد ہوئے اور آخرت میں عذاب کے مستحق ہوئے۔

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ	اور لڑتے رہو ان سے یہاں تک کہ نہ رہے فساد اور ہو جائے حکم سب اللہ کا،
فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ وَاِنْ تَوَلَّوْا	پھر اگر وہ باز آجائیں تو اللہ ان کے کام کو دیکھتا ہے۔ اور اگر وہ روگردانی

فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ ۭ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ۝۴۰

تو جان لو کہ اللہ تمہارا حامی ہے، کیا خوب حامی ہے اور کیا خوب مددگار ہے۔

خلاصۂ تفسیر

اور (پھر ان کے اس کافر رہنے کی صورت میں اے مسلمانو) تم ان (کفار عرب) سے اس حد تک لڑو کہ ان میں فساد عقیدہ (یعنی شرک) نہ رہے اور (اللہ کا) دین (خالص) اللہ ہی کا ہو جائے (اور کسی کے دین کا خالصۃً اللہ ہی کے لئے ہو جانا موقوف ہے قبولِ اسلام پر۔ تو حاصل یہ ہوا کہ شرک چھوڑ کر اسلام اختیار کریں۔ خلاصہ یہ کہ اگر اسلام نہ لائیں تو ان سے (لڑو جب تک اسلام نہ لائیں کیونکہ کفار عرب سے جزیہ نہیں لیا جاتا) پھر اگر یہ (کفر سے) باز آجائیں تو (ان کے ظاہری اسلام کو قبول کرو دل کا حال مت ٹٹولو کیونکہ اگر یہ دل سے ایمان نہ لائیں گے تو) اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو خوب دیکھتے ہیں (وہ آپ سمجھ لیں گے تم کو کیا) اور اگر (اسلام سے) روگردانی کریں تو (اللہ کا نام لے کر ان کے مقابلہ سے مت ہٹو اور) یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ (ان کے مقابلہ میں) تمہارا رفیق ہے وہ بہت اچھا رفیق ہے اور بہت اچھا مددگار ہے (سو وہ تمہاری رفاقت اور نصرت کرے گا)۔

معارف و مسائل

یہ سورۂ انفال کی انتالیسویں آیت ہے اس میں دو لفظ قابل غور ہیں ایک لفظ فتنہ دوسرا دین۔ یہ دونوں لفظ عربی لغت کے اعتبار سے کئی معنی کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔

ائمۂ تفسیر صحابہ و تابعین سے اس جگہ دو معنی منقول ہیں۔ ایک یہ کہ فتنہ سے مراد کفر و شرک اور دین سے مراد دینِ اسلام لیا جائے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے یہی تفسیر منقول ہے۔ اس تفسیر پر معنی آیت کے یہ ہوں گے کہ مسلمانوں کو کفار سے قتال اُس وقت تک جاری رکھنا چاہئے جب تک کہ کفر مٹ کر اُس کی جگہ اسلام آجائے اسلام کے سوا کوئی دین و مذہب باقی نہ رہے۔ اس صورت میں یہ حکم صرف اہل مکہ اور اہل عرب کے لئے مخصوص ہوگا۔ کیونکہ جزیرۃ العرب اسلام کا گھر ہے اس میں اسلام کے سوا کوئی دوسرا دین رہے تو دینِ اسلام کے لئے خطرہ ہے۔ باقی ساری دنیا میں دوسرے ادیان و مذاہب کو قائم رکھا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم کی دوسری آیات اور روایاتِ حدیث اس پر شاہد ہیں۔

اور دوسری تفسیر جو حضرت عبداللہ بن عمرؓ وغیرہ سے منقول ہے وہ یہ ہے کہ فتنہ سے مراد اس جگہ وہ ایذاء اور عذاب و مصیبت ہے جس کا سلسلہ کفارِ مکہ کی طرف سے مسلمانوں پر ہمیشہ جاری رہا تھا

جب تک وہ مکہ میں تھے تو ہر وقت ان کے زمرہ میں پھنسے ہوئے طرح طرح کی ایذائیں سہتے رہے پھر جب مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی تو ایک ایک مسلمان کا تعاقب کر کے قتل و غارتگری کرتے رہے مدینہ میں پہنچنے کے بعد بھی پورے مدینہ پر حملوں کی صورت میں ان کا غیظ و غضب ظاہر ہوتا رہا۔

اور اس کے بالمقابل دین کے معنی قہر و غلبہ کے ہیں اس صورت میں تفسیر آیت کی یہ ہوگئی کہ مسلمانوں کو کفار سے اُس وقت تک قتال کرتے رہنا چاہئے جب تک کہ مسلمان ان کے مظالم سے محفوظ نہ ہو جائیں اور دین اسلام کا غلبہ نہ ہو جائے کہ وہ غیروں کے مظالم سے مسلمانوں کی حفاظت کر سکے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے ایک واقعہ سے بھی اسی تفسیر کی تائید ہوتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب امیر مکہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے مقابلہ میں حجاج بن یوسف نے فوج کشی کی اور دونوں طرف مسلمانوں کی تلواریں مسلمانوں کے مقابلہ پر چل رہی تھیں تو دو شخص حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس حاضر ہوئے اور کہا کہ اس وقت جس بلاء میں مسلمان مبتلا ہیں آپ دیکھ رہے ہیں حالانکہ آپ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے ہیں جو کسی طرح ایسے فتنوں کو برداشت کرنے والے نہ تھے۔ کیا سبب ہے کہ آپ اس فتنہ کو رفع کرنے کے لئے میدان میں نہیں آتے۔ تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی مسلمان کا خون بہانا حرام قرار دیا ہے۔ ان دونوں نے عرض کیا کہ کیا آپ قرآن کی یہ آیت نہیں پڑھتے قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ۔ یعنی مقاتلہ کرتے رہو یہاں تک کہ فتنہ نہ رہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ بیشک میں یہ آیت پڑھتا ہوں اور اس پر عمل بھی کرتا ہوں۔ ہم نے اس آیت کے مطابق کفار سے قتال جاری رکھا یہاں تک کہ فتنہ ختم ہوگیا اور غلبہ دین اسلام کا ہوگیا۔ اور تم لوگ یہ چاہتے ہو کہ اب باہم قتال کر کے فتنہ پھر پیدا کر دو اور غلبہ غیر اللہ کا اور دینِ حق کے خلاف کا ہو جائے۔ مطلب یہ تھا کہ جہاد و قتال کا حکم فتنۂ کفر اور مظالم کفار کے مقابلہ میں تھا وہ ہم کر چکے اور برابر کرتے رہے یہاں تک کہ یہ فتنہ فرو ہوگیا۔ مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگی کو اُس پر قیاس کرنا صحیح نہیں بلکہ مسلمانوں کے باہمی مقاتلہ کے وقت تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات یہ ہیں کہ اس میں بیٹھا رہنے والا کھڑا ہونے والے سے بہتر ہے۔

خلاصہ اس تفسیر کا یہ ہے کہ مسلمانوں پر اعداء اسلام کے خلاف جہاد و قتال اُس وقت تک واجب ہے جب تک کہ مسلمانوں پر اُن کے مظالم کا فتنہ ختم نہ ہو جائے اور اسلام کو سب ادیان پر غلبہ حاصل نہ ہو جائے۔ اور یہ صورت صرف قرب قیامت میں ہوگی اس لئے جہاد کا حکم قیامت تک جاری اور باقی ہے۔

اعداء اسلام کے خلاف جہاد و قتال کے نتیجہ میں دو صورتیں پیدا ہو سکتی تھیں۔ ایک یہ کہ وہ مسلمانوں پر ظلم و جور سے باز آجائیں خواہ اس طرح کہ اسلامی برادری میں داخل ہو کر بھائی بن جائیں

یا اس طرح کہ اپنے مذہب پر رہتے ہوئے مسلمانوں پر ظلم وستم سے باز آجائیں اور اطاعت کا معاہدہ کرلیں۔
دوسرے یہ کہ وہ ان دونوں صورتوں میں سے کسی کو قبول نہ کریں اور مقابلہ پر جمے رہیں اگلی آیت میں ان دونوں صورتوں کے احکام مذکور ہیں۔ ارشاد فرمایا:

فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ یعنی اگر وہ باز آجائیں تو اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو خوب دیکھتے ہیں۔

اُس کے مطابق اُن کی ساتھ معاملہ فرما دیں گے جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر وہ باز آجائیں تو ان کے خلاف جہاد کو بند کر دیا جائے۔ اس صورت میں مسلمانوں کو یہ خطرہ ہو سکتا تھا کہ معرکہ قتال کے بعد کفار کی طرف سے صلح کا معاہدہ یا مسلمان ہو جانے کا اظہار بہت ممکن ہے کہ محض کوئی جنگی چال اور دھوکہ ہو۔ ایسی صورت میں جنگ بند کر دینا مسلمانوں کے لئے مضر ہو سکتا ہے۔ اس کا جواب ان الفاظ سے دیا گیا کہ مسلمان تو ظاہری اعمال کے پابند ہیں، دلوں کا دیکھنے والا اور اُن کے مخفی سرائر کا جاننے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ اس لئے جب وہ مسلمان ہونے کا اظہار کریں یا معاہدہ صلح کرلیں تو مسلمان اس پر مجبور ہیں کہ جہاد وقتال بند کر دیں۔ رہا یہ معاملہ کہ اُنھوں نے سچے دل سے اسلام یا صلح کو قبول کیا ہے یا اس میں دھوکہ ہے اس کو اللہ تعالیٰ خوب دیکھتے جانتے ہیں اگر وہ ایسا کریں گے تو اُس کا دوسرا انتظام ہو جائے گا۔ مسلمانوں کو ان خیالات اور خطرات پر اپنے معاملات کی بنیاد نہیں رکھنا چاہئے۔

اگر اظہارِ اسلام یا معاہدہ صلح کے بعد اُن پر ہاتھ اُٹھایا گیا تو جہاد کرنے والے مجرم ہو جائیں گے جیسا کہ صحیح بخاری ومسلم کی ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مجھے اس کا حکم دیا گیا ہے کہ میں دشمنانِ اسلام سے قتال کرتا رہوں یہاں تک کہ وہ کلمہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کو قبول کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور جب وہ ایسا کرلیں تو اُن کے خون اور اموال سب محفوظ ہو جائیں گے۔ بجز اس کے کہ اسلامی قانون کے ماتحت کسی جرم کی پاداش میں اُن کو سزا دی جائے۔ اور اُن کے دلوں کا حساب اللہ پر رہے گا کہ وہ سچے دل سے اس کلمہ اور اعمال اسلام کو قبول کر رہے ہیں یا نفاق سے۔

دوسری ایک حدیث جو ابوداؤد نے بہت سے صحابہ کرام کی روایت سے نقل کی ہے یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کسی معاہد پر یعنی اُس شخص پر جس نے اسلامی حکومت کی اطاعت ووفاداری کا معاہدہ کرلیا ہو کوئی ظلم کرے یا اُس کو نقصان پہنچائے یا اُس سے کوئی ایسا کام لے جو اُس کی طاقت سے زائد ہے یا اُس کی کوئی چیز بغیر اس کی دلی رضامندی کے حاصل کرے تو میں قیامت کے دن اس مسلمان کے خلاف معاہد کی حمایت کروں گا۔

قرآن مجید کی آیت مذکورہ اور روایاتِ حدیث نے بظاہر مسلمانوں کو ایک سیاسی خطرہ میں مبتلا

کر دیا کہ بڑے سے بڑا دشمنِ اسلام جب ان کی زد میں آجائے اور محض جان بچانے کے لئے کلمۂ اسلام پڑھ لے تو مسلمانوں پر لازم کر دیا کہ فوراً اپنا ہاتھ روک لیں اس طرح تو وہ کسی دشمن پر بھی قابو نہیں پا سکتے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اُن کے مخفی سرائر کو اپنے ذمہ لے کر معجزانہ انداز میں یہ کر دکھایا کہ عملی طور پر مسلمانوں کو کسی میدانِ جنگ میں ایسا ابتلاء پیش نہیں آیا۔ البتہ صلح کی حالت میں سیکڑوں منافقین پیدا ہوئے جنھوں نے دھوکہ دینے کے لئے اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کیا اور بظاہر نماز روزہ بھی ادا کرنے لگے۔ ان میں سے بعض کم ظرف لوگوں کا تو اتنا ہی مقصد تھا کہ مسلمانوں سے کچھ فوائد حاصل کرلیں اور دشمنی کرنے کے باوجود ان کے انتقام سے محفوظ رہیں۔ اور بعض وہ بھی تھے جو سیاسی مقصد لے کر مسلمانوں کے راز معلوم کرنے اور مخالفین سے سازش کرنے کے لئے ایسا کر رہے تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ کے قانون نے ان سب کے بارہ میں مسلمانوں کو یہی ہدایت دی کہ وہ ان کے ساتھ مسلمانوں کا سا معاملہ کریں جب تک خود اُن کی طرف سے اسلام دشمنی اور معاہدہ کی خلاف ورزی ثابت نہ ہو جائے۔

قرآن کی یہ تعلیم تو اُس صورت میں تھی جب کہ دشمنانِ اسلام اپنی دشمنی سے باز آجانے کا اقرار اور معاہدہ کرلیں۔

اور دوسری صورت یہ ہے کہ وہ اپنی ضد اور عناد پر قائم رہیں اُس کے متعلق حکم اس کے بعد کی آیت میں ارشاد فرمایا وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ ۭ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ۔ یعنی اگر وہ بات نہ مانیں تو تم یہ سمجھ رکھو کہ اللہ تعالیٰ تمہارا مددگار حمایتی ہے اور وہ بہت اچھا حمایتی اور بہت اچھا مددگار ہے۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ اگر وہ اپنے ظلم وجور اور کفر وشرک سے باز نہ آئیں تو مسلمانوں کے ذمہ وہی حکم ہے جو اوپر مذکور ہوا کہ اُن سے قتال جاری رکھیں۔ اور جہاد وقتال چونکہ بڑے لشکر اور بہت سے اسلحہ اور ساز وسامان پر عادۃً موقوف ہے اور مسلمانوں کو عام طور پر یہ چیزیں کم حاصل تھیں اس لئے یہ ہو سکتا تھا کہ مسلمانوں کو حکم قتال بھاری معلوم ہو یا وہ اپنی قلتِ تعداد اور قلتِ سامان کی وجہ سے یہ محسوس کرنے لگیں کہ ہم مقابلہ میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اس لئے اس کا علاج اس طرح کیا گیا کہ مسلمانوں کو بتلایا گیا کہ اگرچہ تعداد اور سامان ان لوگوں کے پاس مسلمانوں سے زائد سہی مگر وہ اللہ تعالیٰ کی غیبی نصرت وحمایت کہاں سے لائیں گے۔ جو مسلمانوں کو حاصل ہے جس کو وہ ہر میدان میں اپنے ساتھ مشاہدہ کرتے رہے ہیں، اور فرمایا کہ یوں تو امداد وحمایت دنیا میں ہر فریق کسی نہ کسی سے حاصل کر ہی لیتا ہے مگر مدار کار اس مددگار کی قوت وطاقت اور علم وتجربہ پر ہوتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طاقت وقوت اور علم وبصر سے زیادہ کیا برابر بھی سارے جہان کو حاصل نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ سب سے بہتر حمایتی اور مددگار ہے۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ

اور جان رکھو کہ جو کچھ تم کو غنیمت ملے کسی چیز سے سو اللہ کے واسطے ہے اس میں سے پانچواں حصہ

وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ

اور رسول کے واسطے اور اس کے قرابت والوں کے واسطے اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں کے واسطے

اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ

اگر تم کو یقین ہے اللہ پر اور اس چیز پر جو ہم نے اتاری اپنے بندے پر فیصلہ کے دن

يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۴۱

جس دن بھڑ گئیں دونوں فوجیں، اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

خلاصۂ تفسیر

اور اس بات کو جان لو کہ جو شئے (کفار سے) بطور غنیمت کے تم کو حاصل ہو تو اس کا حکم یہ ہے کہ (اس کے کل پانچ حصے کئے جائیں جن میں سے چار حصے تو مقاتلین کا حق ہے اور ایک حصہ یعنی) اس کا پانچواں حصہ (پھر پانچ حصوں پر تقسیم ہوگا جن میں سے ایک تو) اللہ کا اور اس کے رسول کا ہے (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ملے گا جن کو دینا بمنزلہ اس کے ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں پیش کر دیا) اور (ایک حصہ) آپ کے قرابت داروں کا ہے اور (ایک حصہ) یتیموں کا ہے (ایک حصہ) غریبوں کا ہے اور (ایک حصہ) مسافروں کا ہے اگر تم اللہ پر یقین رکھتے ہو اور اس چیز پر (یقین رکھتے ہو) جس کو ہم نے اپنے بندہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر فیصلہ کے دن (یعنی) جس دن کہ (بدر میں) دونوں جماعتیں (مؤمنین اور کفار کی) باہم مقابل ہوئی تھیں نازل فرمایا تھا (مراد اس سے امداد غیبی بواسطۂ ملائکہ کے ہے یعنی اگر ہم پر اور ہمارے الطافِ غیبیہ پر یقین رکھتے ہو تو اس حکم کو جان رکھو اور عمل کرو یہ اس لئے بڑھا دیا کہ خُمس نکالنا شاق نہ ہو اور یہ سمجھ لیں کہ یہ ساری غنیمت اللہ ہی کی امداد سے تو ہاتھ آئی پھر اگر ہم کو ایک خمس نہ ملا تو کیا ہوا وہ چار خمس بھی تو ہماری قدرت سے خارج تھے بلکہ محض قدرتِ الٰہیہ سے حاصل ہوئے) اور اللہ (ہی) ہر شئے پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں (پھر تمہارا استحقاق تو اتنا بھی نہیں تھا یہ بھی بہت مل گیا)۔

معارف و مسائل

اس آیت میں مالِ غنیمت کے احکام اور اس کی تقسیم کا قانون مذکور ہے۔ اس سے پہلے چند ضروری الفاظ کی تشریح سن لیجئے۔

لفظ غنیمت لغت میں اُس مال کے لئے بولا جاتا ہے جو دشمن سے حاصل کیا جائے۔ اصطلاحِ شریعت میں غیر مسلموں سے جو مال جنگ و قتال اور قہر و غلبہ کے ذریعہ حاصل ہو اُس کو غنیمت کہتے ہیں اور جو صلح و رضامندی سے حاصل ہو جیسے جزیہ و خراج وغیرہ اُس کو فَیْئ کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں انھیں دونوں لفظوں سے ان دونوں قسموں کے احکام بتلائے گئے ہیں۔ سورۂ انفال میں مالِ غنیمت کے احکام کا ذکر ہے جو جنگ و قتال کے وقت غیر مسلموں سے حاصل ہو۔

یہاں سب سے پہلے ایک بات پیشِ نظر رہنا چاہئے وہ یہ کہ اسلامی اور قرآنی نظریہ کے مطابق تمام کائنات کی اصلی ملکیت صرف اُس ذاتِ حق تعالیٰ کی ہے جس نے اُنھیں پیدا کیا ہے انسان کی طرف کسی چیز کی ملکیت کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے قانون کے ذریعہ کسی شخص کی ملکیت قرار دے دی ہو۔ جیسے سورۂ یٰسین میں چوپائے جانوروں کے ذکر میں ارشاد فرمایا اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَآ اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ۔ یعنی کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ چوپاؤں کو ہم نے اپنے ہاتھوں سے بنایا پھر لوگ اُن کے مالک بن گئے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی ملکیت ذاتی نہیں ہم نے اپنے فضل سے اُن کو مالک بنا دیا۔

جب کوئی قوم اللہ تعالیٰ سے بغاوت کرتی ہے یعنی کفر و شرک میں مبتلا ہو جاتی ہے تو پہلے حق تعالیٰ ان کی اصلاح کے لئے اپنے رسول اور کتابیں بھیجتے ہیں جو بدبخت اس انعامِ الٰہی سے بھی متاثر نہیں ہوتے تو اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو اُن کے مقابلہ میں جہاد و قتال کا حکم دے دیتے ہیں جس کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ ان باغیوں کے جان و مال سب مباح کر دیئے گئے ان کو اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے اموال سے نفع اُٹھانے کا حق نہیں رہا۔ بلکہ ان کے اموال بحق سرکار ضبط ہو گئے۔ انھیں ضبط شدہ اموال کا دوسرا نام مالِ غنیمت ہے۔ جو کفار کی ملکیت سے نکل کر خالص حق تعالیٰ کی ملکیت میں رہ گئے۔

ان ضبط شدہ اموال کے لئے زمانۂ قدیم سے حق تعالیٰ کا قانون یہ رہا ہے کہ ان سے کسی کو فائدہ اٹھانے کی اجازت نہیں ہوتی تھی بلکہ ایسے اموال کو جمع کر کے کسی کھلی جگہ میں رکھ دیا جاتا اور آسمان سے ایک بجلی آ کر اُن کو جلا دیتی تھی۔ یہی علامت ہوتی تھی اس جہاد کے قبول ہونے کی۔

خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو جو چند خصوصیات حق تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوئیں اُن میں ایک

یہ بھی ہے کہ مالِ غنیمت آپ کی اُمت کے لئے حلال کر دیا گیا۔ (کمافی حدیث مسلم) اور حلال بھی ایسا کہ اُس کو اُطیب الاموال کہا جاتا ہے یعنی سب سے زیادہ پاک مال۔ وجہ یہ ہے کہ جو مال انسان اپنے کسب اور کمائی سے حاصل کرتا ہے اُس میں انسانوں کی ملکیت سے واسطہ در واسطہ منتقل ہو کر ایک مال اس کی ملکیت میں آتا ہے اور ان واسطوں میں حرام و ناجائز یا مکروہ طریقوں کا احتمال رہتا ہے بخلاف مالِ غنیمت کے کہ کفار کی ملکیت اُن سے ختم ہو کر براہِ راست حق تعالیٰ کی ملکیت رہ گئی اور اب جس کو ملتا ہے براہِ راست حق تعالیٰ کی ملکیت سے ملتا ہے جس میں کوئی شبہ اور شائبۂ حُرمت یا کراہت کا نہیں رہتا جیسے کنوئیں سے نکالا ہوا پانی یا خودرو گھاس جو براہِ راست حق تعالیٰ کا انعام انسان کو ملتا ہے کوئی انسانی واسطہ درمیان میں نہیں ہوتا۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مالِ غنیمت جو پچھلی امتوں کے لئے حلال نہیں تھا اُمتِ مرحومہ کے لئے بطورِ انعام حلال کر دیا گیا۔ آیتِ مذکورہ میں اُس کی تقسیم کا ضابطہ اس عنوان سے بیان فرمایا گیا ہے کہ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ۔ اس میں عربی لغت کے قاعدہ سے اوّل تو لفظ ما عموم پر دلالت کرتا ہے پھر اُس عموم کی تاکید مزید کے لئے لفظ مِنْ شَیْءٍ بڑھایا گیا جس کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ چھوٹی بڑی چیز مالِ غنیمت میں حاصل ہو وہ سب اسی قانون کے تحت داخل ہے کسی چیز کو معمولی یا چھوٹا سمجھ کر کوئی شخص قانون تقسیم کے علاوہ اگر لے گا تو وہ سخت مجرم قرار پائے گا۔ اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک سوئی اور اُس کا دھاگہ بھی جو مالِ غنیمت کا جُز ہو کسی کے لئے اُس کا بغیر اپنے حصہ شرعی کے لے لینا جائز نہیں۔ اور مالِ غنیمت میں سے کوئی چیز بغیر حصہ کے لینے کو حدیث میں غلول فرما کر اُس پر شدید وعید فرمائی ہے اور عام چوری سے زیادہ شدید حرام قرار دیا ہے۔

ضابطۂ تقسیم کا یہ عنوان دے کر تمام مجاہد مسلمانوں کو اس سے باخبر کر دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ مال تمہارے لئے حلال کر دیا ہے مگر ایک خاص ضابطہ کے تحت حلال ہے اُس کے خلاف اگر کوئی لے گا تو وہ جہنم کا ایک انگارہ ہوگا۔

قرآنی قانون کا یہی وہ امتیاز ہے جو دنیا کے دوسرے قوانین کو حاصل نہیں۔ اور یہی قانونِ قرآنی کی تاثیر کامل اور کامیابی کا اصلی راز ہے کہ اول خوفِ خدا و آخرت کو پیش نظر کر کے اُس سے ڈرایا گیا دوسرے نمبر میں تعزیری سزائیں بھی جاری کی گئیں۔

ورنہ غور کا مقام ہے کہ عین میدانِ جنگ کی افراتفری کے وقت جو اموال غیر مسلموں کے قبضہ سے حاصل کئے جائیں جن کی تفصیل نہ پہلے سے مسلمانوں کے امیر کے علم میں ہے نہ کسی دوسرے کے۔ اور موقع میدانِ جنگ کا ہے جو عموماً جنگل اور صحراء ہوتے ہیں جن میں چھپنے چھپانے کے ہزاروں

مواقع ہوتے ہیں۔ نرے قانون کے زور سے ان اموال کی حفاظت کسی کے بس میں نہیں، صرف خوفِ خدا و آخرت ہی وہ چیز تھی جس نے ایک ایک مسلمان کو ان اموال میں ادنیٰ تصرف کرنے سے باز رکھا۔

اب اس ضابطۂ تقسیم کو دیکھئے ارشاد فرمایا فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ۔ یعنی مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ اللہ کا اور اس کے رسول کا اور اس کے رشتہ داروں کا اور یتیموں، مسکینوں، مسافروں کا ہے۔

یہاں پہلے تو یہ بات غور طلب ہے کہ ضابطہ پورے مالِ غنیمت کی تقسیم کا بیان ہو رہا ہے مگر قرآن نے صرف اس کے پانچویں حصے کی تقسیم کا ضابطہ یہاں ذکر فرمایا باقی چار حصوں کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔ اس میں کیا راز ہے اور باقی چار حصوں کی تقسیم کا کیا قانون ہے۔ لیکن قرآن میں غور و تدبر کرنے سے ان دونوں باتوں کا جواب انہیں لفظوں میں یہ نکل آتا ہے کہ قرآن کریم نے جہاد کرنے والے مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا مَا غَنِمْتُمْ یعنی جو کچھ تم نے غنیمت میں حاصل کیا۔ اس میں اشارہ پایا جاتا ہے کہ یہ مال ان حاصل کرنے والوں کا حق ہے اور اس کے بعد جب یہ ارشاد فرما دیا کہ اس میں سے پانچواں حصہ اللہ اور رسول وغیرہ کا ہے تو اس کا نتیجہ صاف یہ نکل آیا کہ باقی چار حصے غانمین اور مجاہدین کے ہیں۔ جیسے قرآن کریم کے قانونِ وراثت میں ایک جگہ ارشاد ہے وَوَرِثَهٗٓ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ۔ یعنی جب کسی شخص کے وارث اُس کے ماں باپ ہوں تو ماں کا تیسرا حصہ ہے۔ یہاں بھی صرف ماں کے ذکر پر اکتفاء کیا گیا جس سے معلوم ہوا کہ باقی دو حصے باپ کا حق ہیں۔ اسی طرح مَا غَنِمْتُمْ کے بعد جب صرف پانچویں حصہ کو اللہ کے لئے رکھا گیا تو معلوم ہوا کہ باقی چار حصے مجاہدین کا حق ہیں۔ پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان اور عمل نے اس کو اور اس کی پوری تفصیلات کو واضح کر دیا کہ یہ چار حصے مجاہدین میں ایک خاص قانون کے تحت تقسیم فرمائے۔

اب اُس پانچویں حصہ کی تفصیل سُنئے جس کو قرآن کریم نے اس آیت میں متعین فرما دیا ہے الفاظِ قرآنی میں اس جگہ چھ الفاظ مذکور ہیں لِلّٰهِ۔ لِلرَّسُوْلِ۔ لِذِی الْقُرْبٰی۔ الْیَتٰمٰی۔ الْمَسٰكِیْنِ۔ ابْنِ السَّبِیْلِ۔

اس میں لفظ لِلّٰهِ تو ایک جامع عنوان ہے اُن مصارف کا جن میں یہ پانچواں حصہ تقسیم ہوگا یعنی یہ سب مصارف خالص اللہ کے لئے ہیں۔ اور اس لفظ کے اس جگہ لانے میں ایک خاص حکمت ہے جس کی طرف تفسیر مظہری میں اشارہ کیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خاندان کے لئے صدقات کا مال حرام قرار دیا گیا ہے کہ وہ آپ کے شایانِ شان نہیں کیونکہ عام لوگوں کے اموال کو پاک کرنے کے لئے ان میں سے نکالا ہوا حصہ ہے جس کو حدیث میں اوساخ الناس

فرمایا ہے یعنی لوگوں کا میل کچیل۔ وہ شانِ نبوت کے لائق نہیں۔

مالِ غنیمت کے پانچویں حصہ میں سے چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خاندان کو بھی قرآن کی اس آیت نے حصہ دیا ہے اس لئے اس پر متنبہ کیا گیا کہ یہ حصہ لوگوں کی ملکیت سے منتقل ہو کر نہیں آیا بلکہ بلا واسطہ اللہ تعالیٰ شانہٗ کی طرف سے ہے۔ جیسا کہ ابھی ذکر کیا گیا ہے کہ مالِ غنیمت کفار کی ملک سے نکل کر براہِ راست حق تعالیٰ کی خالص ملکیت ہو جاتا ہے پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور انعام تقسیم ہوتا ہے۔ اس لئے اس بات کی طرف اشارہ کرنے کے لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ذوی القربیٰ کو جو حصہ مال غنیمت کے خمس سے دیا گیا ہے وہ لوگوں کے صدقات کا نہیں بلکہ براہ راست حق تعالیٰ کی طرف سے فضل و انعام ہے۔ شروع آیت میں فرمایا گیا لِلّٰہِ یعنی یہ سب مال اصل میں خالص ملکیت اللہ تعالیٰ کی ہے، اُسی کے فرمان کے مطابق مذکورہ مصارف میں خرچ کیا جائے گا۔

اس لئے اس خُمس کے اصلی مصارف پانچ رہ گئے رسول۔ ذوی القربیٰ۔ یتیم۔ مسکین، مسافر پھر ان میں استحقاق کے درجے مختلف ہیں۔ قرآن کریم کی بلاغت دیکھئے کہ ان درجاتِ استحقاق کا فرق کس باریک اور لطیف انداز سے ظاہر فرمایا گیا ہے کہ ان پانچ میں سے پہلے دو پر حرف لام لایا گیا لِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی۔ اور باقی تین قسموں کو بغیر حرف لام کے باہم معطوف بنا کر ذکر کر دیا گیا۔

حرف لام عربی زبان میں کسی خصوصیت کے اظہار کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ لفظ لِلّٰہِ میں حرف لام اختصاص ملکیت کے بیان کے لئے ہے کہ اصل مالک سب چیزوں کا اللہ تعالیٰ ہے اور لفظ للرسول میں استحقاق کی خصوصیت کا بیان مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خُمس غنیمت کے صَرف کرنے اور تقسیم کرنے کا حق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمایا۔ جس کا حاصل امام طحاوی کی تحقیق اور تفسیر مظہری کی تقریر کے مطابق یہ ہے کہ اگرچہ اس جگہ خُمس کے مصارف میں پانچ ناموں کا ذکر ہے لیکن درحقیقت اس میں پورا تصرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے کہ آپ اپنی صوابدید کے مطابق ان پانچ قسموں میں خُمس غنیمت کو صَرف فرمائیں جیسا کہ سورۃ انفال کی پہلی آیت میں پورے مالِ غنیمت کا حکم یہی تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی صوابدید کے مطابق جہاں چاہیں صرف فرمائیں جس کو چاہیں دیں۔ آیت وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ نے کل مالِ غنیمت کے پانچ حصے کر کے چار کو مجاہدین کا حق قرار دے دیا مگر پانچواں حصہ بدستور اُسی حکم میں رہا کہ اس کا صَرف کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صوابدید پر چھوڑا گیا صرف اتنی بات کا اضافہ ہوا کہ اس پانچویں حصے کے پانچ مصارف بیان کر دیئے گئے کہ یہ ان میں دائر رہے گا۔ مگر جمہور ائمہ اہل تحقیق کے نزدیک آپ کے ذمہ یہ لازم نہیں تھا کہ اس خُمس کے پانچ حصے برابر کریں اور مندرجہ آیت پانچوں قسموں میں برابر تقسیم کریں بلکہ صرف

اتنا ضروری تھا کہ خُمس غنیمت کو انھیں پانچ قسموں کے اندر سب کو یا بعض کو اپنی صوابدید کے مطابق عطا فرمائیں۔

اس کی سب سے بڑی واضح دلیل خود اس آیت کے الفاظ اور اُن میں بیان کی ہوئی مصارف کی قسمیں ہیں کہ یہ سب قسمیں عملاً الگ الگ نہیں بلکہ باہم مشترک بھی ہو سکتی ہیں مثلاً جو شخص ذَوِی الْقُرْبٰی میں داخل ہے وہ یتیم بھی ہو سکتا ہے مسکین اور مسافر بھی۔ اسی طرح مسکین اور مسافر یتیم بھی ہو سکتے ہیں ذَوِی الْقُرْبٰی بھی، جو مسکین ہے وہ مسافر کی فہرست میں بھی آ سکتا ہے اگر ان سب قسموں میں الگ الگ برابر تقسیم کرانا مقصود ہوتا تو یہ قسمیں ایسی ہونا چاہئے تھیں کہ ایک قسم کا آدمی دوسری قسم میں داخل نہ ہو۔ ورنہ پھر یہ لازم آئیگا کہ جو ذَوِی الْقُرْبٰی میں سے ہے اور وہ یتیم بھی ہے مسکین بھی مسافر بھی تو اُس کو ہر حیثیت سے ایک ایک حصہ ملا کر چار حصے دیئے جائیں جیسا کہ تقسیم فرائض و میراث کا یہی قاعدہ ہے کہ ایک شخص کو میت کے ساتھ مختلف قسم کی قرابتیں حاصل ہیں تو ہر قرابت کا حصہ اُس کو الگ ملتا ہے اور اُمت میں اس کا کوئی قائل نہیں کہ ایک شخص کو چار حصے دیئے جائیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ مقصود اس آیت کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ پابندی عائد کرنا نہیں ہے کہ ان سب قسموں کو ضرور ہی دیں اور برابر دیں۔ بلکہ مقصود یہ ہے کہ خمس غنیمت کا مال ان پانچ قسموں میں سے جس قسم پر جتنا خرچ کرنا آپ کی رائے میں مناسب ہو اُتنا دے دیں (تفسیر مظہری)۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے جب اس خمس میں سے ایک خادم کا سوال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا اور گھر کے کاموں میں اپنی محنت و مشقت اور کمزوری کا سبب بھی ظاہر کیا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ عذر فرما کر اُن کو دینے سے انکار کر دیا کہ میرے سامنے تمھاری ضرورت سے زیادہ اہل صفہ صحابہ کرام کی ضرورت ہے جو انتہائی فقر و افلاس میں مبتلا ہیں اُن کو چھوڑ کر میں تمھیں نہیں دے سکتا۔ (صحیح بخاری و مسلم)

اس سے واضح ہو گیا کہ ہر ایک قسم کا الگ حق نہیں تھا ورنہ ذوی القربیٰ کے حق میں فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا سے کون مقدم ہوتا۔ بلکہ یہ سب بیانِ مصارف ہے بیانِ استحقاق نہیں۔

تقسیم خمس بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

جمہور ائمہ کے نزدیک خمس غنیمت میں جو حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رکھا گیا وہ آپ کے منصب نبوت و رسالت کی بنا پر ایسا ہی تھا جیسے آپ کو خصوصی طور پر یہ بھی حق دیا گیا تھا کہ پورے مال غنیمت میں آپ اپنے لئے کوئی چیز انتخاب کر کے لے لیں جس کی وجہ سے بعض غنیمتوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض اشیاء لی بھی تھیں۔ اور خمس غنیمت میں سے آپ اپنا اور اپنے اہل و عیال کا نفقہ ادا فرماتے تھے۔ آپ کی وفات کے بعد یہ حصہ خود بخود ختم ہو گیا کیونکہ آپ کے بعد کوئی رسول و نبی نہیں۔

خمس ذوی القربیٰ اس میں تو کسی کا اختلاف نہیں کہ فقراء ذوی القربیٰ کا حق خمس غنیمت میں دوسرے مصارف یعنی یتیم، مسکین، مسافر سے مقدم ہے۔ کیونکہ فقراء ذوی القربیٰ کی امداد زکوٰۃ وصدقات سے نہیں ہوسکتی دوسرے مصارف زکوٰۃ وصدقات سے بھی ہوسکتے ہیں (کما صرح بہ فی الہدایہ ویقدمون) البتہ اغنیاء ذوی القربیٰ کو ــــــ اس میں سے دیا جائے گا یا نہیں۔ اس میں امام اعظم ابوحنیفہؒ کا فرمانا یہ ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی جو ذوی القربیٰ کو عطا فرماتے تھے تو اُس کی دو بنیادیں تھیں ایک اُن کی حاجتمندی اور فقر دوسرے اقامتِ دین اور دفاع عن الاسلام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت وامداد۔ دوسرا سبب تو وفاتِ نبوی کے ساتھ ختم ہوگیا صرف پہلا سبب فقر وحاجتمندی رہ گیا اُس کی بناء پر تاقیامت ہر امام وامیر اُن کو دوسروں سے مقدم رکھے گا (ہدایہ۔ جصاص)۔ امام شافعیؒ سے بھی یہی قول منقول ہے (قرطبی)

اور بعض فقہاء کے نزدیک سہم ذوی القربیٰ بحیثیت قرابت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ کے لئے باقی ہے جس میں اغنیاء اور فقراء سب شریک ہیں البتہ امیر وقت اپنی صوابدید کے مطابق اُن کو حصہ دے گا۔ (مظہری)

اور اصل چیز اس معاملہ میں خلفاء راشدین کا تعامل ہے کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کیا کیا۔ صاحب ہدایہ نے اس کے متعلق لکھا ہے۔

ان الخلفاء الاربعۃ الراشدین قسموہ علیٰ ثلثۃ اسہم۔	چاروں خلفاء راشدین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خمس غنیمت کو صرف تین قسموں میں تقسیم فرمایا ہے یتیم، مسکین، فقیر۔

البتہ حضرت فاروق اعظمؓ سے ثابت ہے کہ فقراء ذوی القربیٰ کو خمس غنیمت سے دیا کرتے تھے (اخرجہ ابوداؤد) اور ظاہر ہے کہ یہ تخصیص صرف فاروقِ اعظمؓ کی نہیں دوسرے خلفاء کا بھی یہی عمل ہوگا۔

اور جن روایات سے یہ ثابت ہے کہ صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ اپنے آخری زمانۂ خلافت تک ذوی القربیٰ کا حق نکالتے تھے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اُس کا متولی بناکر ذوی القربیٰ میں تقسیم کراتے تھے (کما فی روایۃ کتاب الخراج لابی یوسف) تو یہ اس کے منافی نہیں ہے کہ وہ تقسیم فقراء ذوی القربیٰ کے لئے مخصوص ہو۔ واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اعلم۔

فائدہ ذوی القربیٰ کی تعیین خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے اس طرح فرمادی کہ بنو ہاشم تو آپ کا اپنا قبیلہ ہی تھا بنو المطلب کو بھی ان کے ساتھ اس لئے شامل

فرمالیا تھا کہ یہ لوگ بھی جاہلیت واسلام میں کبھی بنو ہاشم سے الگ نہیں ہوئے یہاں تک کہ قریش مکہ نے جب غذائی مقاطعہ بنوہاشم کا کیا اور اُن کو شعب ابی طالب میں بند کردیا تو بنو المطلب کو اگرچہ قریش نے مقاطعہ میں داخل نہیں کیا تھا مگر یہ لوگ اپنی رضامندی سے مقاطعہ میں شریک ہوگئے (مظہری)

غزوۂ بدر کے دن کو یوم الفرقان فرمایا گیا آیتِ مذکورہ میں بدر کے دن کو یوم الفرقان فرمایا ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ سب سے پہلے مادی اور ظاہری طور پر مسلمانوں کی واضح فتح اور کفار کی عبرتناک شکست اس دن میں ہونے کی بناء پر کفر و اسلام کا ظاہری فیصلہ بھی اس دن ہوگیا۔

إِذْ أَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوَىٰ وَالرَّكْبُ

جس وقت تم تھے ورلے کنارہ پر اور وہ پرلے کنارہ پر اور قافلہ

أَسْفَلَ مِنْكُمْ ۚ وَلَوْ تَوَاعَدْتُمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيعَادِ ۙ وَلَٰكِنْ

نیچے اتر گیا تھا تم سے، اور اگر تم آپس میں وعدہ کرتے تو نہ پہنچتے وعدہ پر ایک ساتھ لیکن

لِيَقْضِيَ اللَّهُ أَمْرًا كَانَ مَفْعُولًا ۙ لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ

اللہ کو کر ڈالنا تھا ایک کام کو جو مقرر ہو چکا تھا، تاکہ مرے جس کو مرنا ہے قیام حجت

بَيِّنَةٍ وَيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ ۗ وَإِنَّ اللَّهَ لَسَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٤٢﴾

کے بعد اور جیوے جس کو جینا ہے قیام حجت کے بعد، اور بیشک اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔

إِذْ يُرِيكَهُمُ اللَّهُ فِي مَنَامِكَ قَلِيلًا ۖ وَلَوْ أَرَاكَهُمْ كَثِيرًا

جب اللہ نے وہ کافر دکھلائے تجھ کو تیری خواب میں تھوڑے، اور اگر تجھ کو بہت دکھلا دیتا

لَفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ سَلَّمَ ۗ إِنَّهُ عَلِيمٌ

تو تم لوگ نامردی کرتے اور جھگڑا ڈالتے کام میں لیکن اللہ نے بچا لیا، اس کو خوب معلوم ہے

بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴿٤٣﴾ وَإِذْ يُرِيكُمُوهُمْ إِذِ الْتَقَيْتُمْ فِي

جو بات ہے دلوں میں۔ اور جب تم کو دکھلائی وہ فوج مقابلہ کے وقت تمہاری

أَعْيُنِكُمْ قَلِيلًا وَيُقَلِّلُكُمْ فِي أَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللَّهُ أَمْرًا كَانَ

آنکھوں میں تھوڑی اور تم کو تھوڑا دکھلایا اُن کی آنکھوں میں تاکہ کر ڈالے اللہ ایک کام جو مقرر

ع ۵ مَفْعُولًا ۗ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ﴿٤٤﴾

ہو چکا تھا، اور اللہ تک پہنچتا ہے ہر کام۔